مذہب شیعہ اور تبلیغ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَ الصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ
وَ آلِہٖ الطَّاہِرِیۡنَ

اسلام میں تبلیغ کی اہمیت

اسلام تبلیغی مذہب ہے اور جب سے اس کی بنیاد پڑی تبلیغ کا پہلو اس کے تعلیمات کا جزو اعظم اور اس کے آئین واصول میں پیش پیش رہا۔ اس کا نشوونما، ترقی ووسعت اور اس کی ابتدائی وانتہائی کامیابیاں سب تبلیغ ہی کے ذریعہ سے تھیں اور یہی اس کی ہر دل عزیزی ومقبولیت کا راز ہے۔

وہ لوگ جو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ تلوار کو قرار دیتے ہیں، انھیں اس پہلو پر غور کر لینے کی ضرورت ہے کہ تلوار اٹھانے کے لئے خود ایک طاقت وقوت درکار ہے اور اس طاقت وقوت کا حصول تلوار کا رہین منت نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ذریعہ کہ جو اسلامی ترقیوں کے لئے سنگ بنیاد کہا جاسکتا ہے، وہ رسول کی قولی وعملی تبلیغ ہی ہے اور کچھ نہیں۔

روحانیت فنا ہو چکی تھی۔ مذہب کی عمارت میں اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ انسانیت کے خط وخال (خدوخال) بگڑے ہوئے تھے اور بہیمیت وحیوانیت کا دور دورہ تھا۔ رواداری وہمدردی بے معنی الفاظ بن چکے تھے اور گمراہی وضلالت کا سیلاب پوری طاقت کے ساتھ بڑھا ہوا تھا اس تاریک دورِ شرک وجاہلیت میں ایک زلزلہ خیز نغمۂ توحید تھا جو ”قُوۡلُوۡا لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفۡلِحُوۡا“ کی آواز کے ساتھ زمین وآسمان کی درمیانی فضا میں گونجتا تھا اور جس میں وہ قوت انقلاب تھی کہ جس نے عالم کو کایا پلٹ کر دیا اور بڑی سے بڑی مادی طاقتوں کو شکست دی۔

اس میں وہ مقناطیسی جذب تھا جس نے قوت احساس رکھنے والے قلوب کو ایک غیر مصنوعی کشش کے ساتھ کھینچ لیا اور ان کے جسم وروح، طرز عمل اور نظام زندگی میں وہ غیر معمولی انقلاب پیدا کیا کہ وہ ایک نئے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے۔ (صِبۡغَۃَ اللّٰہِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبۡغَۃً وَنَحۡنُ لَہٗ عَابِدُوۡنَ)

یہ مختصر کلمۂ توحید اگر کسی فوج ولشکر کی حیثیت رکھتا ہے، اگر اس میں تلوار کی برش، نیزہ کی لچک اور توپ کی گرج ہے تو یہ بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اسلام تلوار کی قوت اور فوج ولشکر کی طاقت سے پھیلا ہے اور اگر ایسا نہیں بلکہ وہ صرف ایک روادارانہ دعوت حق اور تبلیغ حقانیت ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کی نشر واشاعت کا ذریعہ تبلیغ تھی اور بس تبلیغ۔

وہ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ کی مخصوص ومحدود دائرہ میں دعوت یا قُمۡ فَاَنۡذِرۡ کا عمومی حکم، اس کی تعبیر بہرحال تبلیغ ہی کے ساتھ ہوسکتی ہے اور اِنَّمَا اَنۡتَ مُنۡذِرٌ میں رسولؐ اسلام کے فرائض کو صرف تبلیغ میں منحصر کرتے ہوئے اِنَّا اَرۡسَلۡنَاکَ کَافَّۃً لِلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا میں ان کے دعوت حقانیت کے صرف دو پہلوؤں کو روشن کیا گیا ہے ایک بشارت اور دوسرے انذار یعنی وعدۂ جنت اور وعید نار جو تبلیغ ہی کے دو شعبے ہیں۔ اور اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ کے جامع الفاظ سے تبلیغ کا دستور عمل اور لائحہ کارگزاری پیش کیا گیا جس کے مندرجہ ہدایات کے مطابق تبلیغ

کے فریضہ کو انجام پذیر ہونا چاہئے۔ اور وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ کے حکم محکم سے ہمیشہ کے لئے دعوت وتبلیغ کے سلسلہ کے باقی رہنے کی پیش بندی کی گئی جس پر کار بند ہونا ہر زمانہ میں فرض کی حیثیت سے لازم ہوا۔

ان آیات میں غور کرنے سے صاف یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جو خاص طریقۂ کار مقرر کیا گیا ہے وہ دعوت وتبلیغ ہے اور اسی کو برابر ہر صورت سے نمایاں کیا جانا ضروری سمجھا گیا ہے لیکن نشر و اشاعت کے سلسلہ میں فوج کشی و صف آرائی وہ اسلام کے اصول اساسی میں کسی جگہ نظر نہیں آتی ورنہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ کے الفاظ میں سب سے پہلے یا بعد دعوت بالسیف کا تذکرہ ضرور ہوتا۔

بلکہ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ اَتُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ مَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ کے الفاظ میں جبر وقہر کی نفی کی گئی ہے۔ اور مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ کہہ کر رسولؐ کے فرض کو حصر کے ساتھ تبلیغ میں معین کیا گیا ہے۔

تاریخ اسلامی کا سرسری نظر سے مطالعہ بھی اس امر کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا کہ رسول اسلامؐ کے طرز عمل میں بھی یہ پہلو بیش از بیش ملحوظ تھا اور وہ دعوت وتبلیغ کے فرض کو اپنا اولین نقطۂ نظر سمجھتے تھے اور وہی آپ کی صداقت کا اصلی جوہر اور آپ کی کامیابی کا حقیقی رمز تھا۔ مکہ کی فضا جہاں تین سو ساٹھ بتوں کی ثنا وستائش کا غلغلہ بلند تھا وہاں دعوت حقانیت کا ایک حیرت انگیز مجسمہ اپنی خاموش و پر امن تبلیغ میں مصروف تھا اور دنیا کی باطل طاقتوں کو اپنے روحانی پیغام کے بے شور و شر نغموں سے متزلزل بنائے ہوئے تھا۔

مہاجرین کی پوری جماعت جس کے کارنامۂ عمل سے اسلامی تاریخ کے ورق آج تک لبریز ہیں بلکہ انصار کی بھی جماعت جس کی فداکاری وجاں نثاری کے پر صداقت عہد و پیمان رسولؐ کی ہجرت کے لئے محرک ہوئے، وہ سب اسی خاموش تبلیغی دور کے نتائج ہیں اور اسلامی کامیابیوں اور سرسبزیوں اور اس کے سنہرے واقعات کا تعلق زیادہ تر اسی جماعت کے ساتھ ہے، ورنہ اسلام کے آخری زمانہ میں اور اسلامی مجاہدات کے بعد، جو مدافعانہ ضروریات سے مجبور ہوکر کئے گئے تھے، جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان میں سے تو بیشتر مؤلفۃ القلوب اور ادنیٰ درجہ کے اشخاص ہیں جن کا اسلام کے روشن وزرّیں خصوصیات میں نہ کوئی ہاتھ ہے اور نہ کوئی تعلق۔ اس سے یہ نتیجہ زیادہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام کا حقیقی جوہر نشر و اشاعت، دعوت وتبلیغ تھا اور اس کے بہترین نتائج کامیابی صرف اسی کا نتیجہ ہیں اور بس۔

علاوہ ان کارگزاریوں کے جو رسالت مآبؐ بذات خود تبلیغ ودعوت کے سلسلے میں انجام دیتے رہے تھے۔ حضرت نے تبلیغی کام کو وسیع پیمانہ پر آگے بڑھانے کے لئے تبلیغی وفود بھی روانہ فرمائے ہیں جن میں ملک حبش، فارس اور اسکندریہ ایسے دور دراز ممالک بھی شامل ہیں اور یمن کی جانب اپنے ابن عم امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالبؑ کو یہ کہہ کر روانہ فرمایا کہ لَاِنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ وَاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا (تمہارے ہاتھ سے ایک شخص کی ہدایت ہوجائے یہ تمہارے لئے تمام دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔)

اس وقت بھی کہ جب اسلام کا مجاہدانہ دور شروع ہو چکا ہے، رسالت مآبؐ کے طرز عمل سے یہ امر صاف نمایاں ہے کہ آپ کا اصلی نقطۂ نظر جنگ کرنا اور فتح وظفر حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ آپ حتی الامکان ایسے مواقع بہم پہنچاتے ہیں کہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔

حدیبیہ کی صلح میں جو اکثر جنگجو طبائع پر گراں بھی گذری یہ پہلو بہت زیادہ نمایاں ہے۔

اسلام کے احکام شرعی اور فرائض مذہبی میں بھی جہاں تک دیکھا جائے بہت زائد تبلیغی مفاد مدنظر رکھا گیا ہے۔

پانچ وقت کا بلند بانگ نعرۂ توحید جو اذان کی صورت سے

بلند ہوتا ہے وہ اسی تبلیغ کی غرض سے ہے اور نماز جماعت کا حکم اور اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا اہتمام اور پھر حج میں تمام اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک مقام پر مجتمع ہونے کی دعوت شوکت اسلامی کے مظاہرہ کی نہایت واضح حیثیت رکھتی ہے۔

رسالت مآبؐ کی زندگی کے آخر کا سب سے بڑا عظیم الشان واقعہ وہ بھی حضرت کی تبلیغی زندگی کا انتہائی اہم باب ہے جس کے متعلق خاص طور سے حضرت احدیت کی طرف سے حکم محکم نازل ہوا تھا کہ یـآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیکَ مِن رَّبِّکَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اور اسی فرض تبلیغ کے ادا ہونے کے بعد یہ پیغام پہنچا تھا کہ اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا اور رسالتمآبؐ نے اس تبلیغ کو ہمہ گیر و غیر محدود بنانے کے لئے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں یہ ارشاد فرمادیا کہ فَلْیُبَلِّغْ الشَّاھِدُ الْغَائِبِ اس وقت موجود رہنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان تک جو موجود نہیں ہیں اِس کی تبلیغ کردیں۔

رسولِ اسلام کے بعد مسلمانوں کے زاویۂ نظر میں اختلاف

مذکورۂ بالا واقعات اور نیز اسلامی تاریخ کے ہر حصہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رسالت مآبؐ کی زندگی کا حقیقی نصب العین اور نقطۂ نظر تبلیغ تھا اور وہی اسلام کی ترقی و اشاعت کا واحد ذریعہ ہے اور اس درمیان میں رسالت مآبؐ کا تلوار اٹھانا اور میدان جنگ میں آنا صرف ضمنی حیثیت رکھتا ہے جو موانع کے رفع کرنے اور جارحانہ طاقتوں کے دفع کرنے کے لئے تھا اور اس کو براہ راست اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں کوئی دخل نہیں ہے۔

لیکن انسانی افراد کا بیشتر حصہ اپنی اُفتادِ طبع کی بناء پر تنگ نظر اور ظاہر بیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے پست خیالی اور مادہ کے قیود میں گرفتاری کی وجہ سے ہر بات کے وجوہ و اسباب کو مادیت میں تلاش کرتا ہے اور ایک بات کو نکال کر اُسی کو واحد سبب قرار دے لیتا ہے اور اس لئے اسلام کی نشر و اشاعت کو جو تمام تر روحانی تعلیم و تلقین اور دعوت و تبلیغ پر مبنی تھی، مادی طاقت و قوت کا نتیجہ خیال کر کے بہت سے اس کے مخالفین یہ کہنے لگے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے اور اس کی ترقی و اشاعت صرف جنگ و خونریزی کا نتیجہ ہے۔

ہمیں ان سے شکایت ہے اور بجا شکایت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جذبۂ عداوت اور تعصب اور شوق اعتراض و نکتہ چینی کی بنا پر اسلامی تاریخ کے واقعات کو انصاف اور صبر و سکون کے ساتھ پڑھا ہی نہیں ہے لیکن اس کو کیا جائے اور اس وقت ہمارے حیرت اور افسوس کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود مسلمانوں نے رسالتمآبؐ کی کامیابی اور اسلام کی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی و اشاعت کے حقیقی فلسفہ پر غور نہیں کیا اور وہ اس میں صحیح نقطہ پر نہ پہنچ سکے۔

رسالت مآبؐ کے بعد مسلمانوں میں جو افتراق پیدا ہوا اور وہ اقلیت و اکثریت دو حصوں میں منقسم ہو گئے، اس میں اکثریت نے یہی سمجھا کہ رسولؐ کی کامیابی کا حقیقی راز صرف تلوار میں مضمر تھا اور جب ہی انھوں نے بڑی کشادہ حوصلگی کے ساتھ تلوار کھینچ لی اور بے دھڑک دوسروں کے مقابلہ پر اس کا استعمال شروع کر دیا اور آس پاس کے ممالک پر فوج کشی اور حملہ آوری میں پوری طاقت صرف کر دی اور اس طرح دنیا کے امن و امان کو خاک میں ملا کر اسلام کو جو سِلم یعنی صلح پسندی سے مشتق (Derivative) ہے، امن و امان کا دشمن ثابت کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اغیار کا یہ الزام کہ ''اسلام تلوار سے پھیلا'' اس کی ذمّہ داری بہت کچھ ان ہی اہل اسلام کے سر ہے، جنھوں نے عملی طور پر اسلامی مفاد اور رسالت مآبؐ کے نصب العین اور نقطۂ نظر کی غلط ترجمانی کی اور یہ ثابت کیا کہ اسلام کی ترقی و اشاعت تلوار کھینچنے پر موقوف ہے۔ ایک طرف تو تیغ آزمائی و صف آرائی میں یہ انہماک اور دوسری طرف اسلام کے حقیقی مفاد یعنی علمی تحقیقات

اور مذہب کی حقیقی تبلیغ و تعلیم کو اس طرح پامال کر دینا کہ وہ فنا کے قریب پہنچ جائے۔ وہ دور کس حد تک روشن کہے جانے کے قابل ہے جس میں معارف و حقائق کا چرچا نہ رہے، فلسفہ الٰہیات اور علم کلام کے مسائل گوشۂ گمنامی میں پڑ جائیں، تصنیف و تالیف کا دروازہ بند ہو اور روایت احادیث پر سخت پابندیاں عائد ہوں، کتب علمیہ کی چھان بین اور جستجو تو کجا، علمی تحقیقات کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں۔

علمی دنیا میں یہ امر کیا اچھی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اس عصر میں اگر کسی شخص کے دل میں کوئی شبہہ پیدا ہوا اور وہ کسی مذہبی مسئلہ کے متعلق تحقیقات کرنا چاہتا ہو تو عوض اس کے کہ اس کے شبہہ کو حل کیا جائے اور اس کی تسکین کی کوشش کی جائے اس کو تازیانہ سے تنبیہ کی جاتی تھی اور اکثر ضرب شدید تک نوبت پہنچا دی جاتی تھی۔

ملاحظہ ہو امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

سیّدنا عمر سدّ باب الکلام و ابحدل وضرب صبیغا بالدرة لما ورد علیه سؤ الا فی تعارض آیتین من کتاب اللّٰہ تعالیٰ وھجرہ وامر الناس یھجرہ۔

(سیدنا عمر نے علم کلام اور مذہبی بحث کے دروازہ کو بند کر دیا اور انھوں نے ایک شخص کو جس کا نام صبیغ تھا درّہ سے مارا، جب اس نے آپ سے قرآن مجید کی دو آیتوں کے باہمی اختلاف کے متعلق سوال کیا اور اس کو جلا وطن کر دیا۔ اور تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس سے قطع تعلق کر دیں۔)

شارح قاموس سید مرتضیٰ زبیدی اپنی کتاب اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین مطبوعۂ مصر، ج ۱ ص ۱۸۹ میں مذکورۂ بالا عبارت کے تحت میں لکھتے ہیں:-

''رأیت بخط الحافظ الذھبی فی کتاب له سمّاہ نعم السمر فی سیرۃ عمر ما نصّه حدثنا مکی بن ابراھیم حدثنا الجعد بن عبدالرحمٰن عن یزید بن خصیفة عن السائب بن یزید قال اتیٰ رجل عمر فقال یا امیر المومنین انا لقینا رجلا یسأل عن تاویل القرأن فقال اللّٰھم امکنی منه فبینا عمر جالس اذ جاء ہ علیه عمامة وثیاب فقال یا امیر المومنین والذاریات ذروا فالحاملات وقرا قال عمر انت ھو فقام الیه وحسر عن ذراعیه فلم یزل یجلدہ حتیٰ سقطت عمامته فقال والذی نفس عمر بیدہ لو وجدتک محلوقا لضربت به راسک البسوہ ثیابه واحملوہ علیٰ قتبا واخرجوہ حتیٰ تقدموا به بلادہ ثم لیقم خطیبا فلیقل ان صبیغا ابتغی العلم فاخطأہ فلم یزل وضیعا فی قومه حتیٰ ھلک وکان سید قومه''

(حافظ ذہبی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تصنیف ''نعم السمر فی سیرۃ عمر'' میں مسلسل سند کے ساتھ تحریر ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر کی خدمت میں آکر بیان کیا کہ ''ایک شخص ہے جو تاویل قرآن کے متعلق کوئی سوال پیش کرتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: ''خدا کرے وہ میرے ہاتھ آجائے۔ اتنی دیر میں وہ شخص آگیا۔ اس کے سر پر عمامہ تھا اور جسم میں اچھا خاصہ لباس تھا۔ اس نے کہا: ''یا امیر المومنین یہ آیت ملاحظہ ہو: والذاریات ذروا فالحاملات وقرا۔''

حضرت عمر ''اچھا تو ہی وہ ہے'' بس یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور آستینیں چڑھا کر کوڑے مارنا شروع کر دیئے۔ اتنے کوڑے لگائے کہ اس کا عمامہ گر گیا اور کہا کہ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے اگر میں تیرا سر منڈا ہوا پاتا تو تیرے سر پر بھی کوڑے لگاتا۔

اچھا اب اس کو اس کے کپڑے پہناؤ اور اس کو ایک اونٹ

پر سوار کر کے یہاں سے نکال باہر کرو اور جب یہ اپنے شہر پہنچے تو وہاں کھڑے ہو کر عام اعلان کرے کہ صبیغ نے معلومات حاصل کرنا چاہے تھے لیکن غلط راستہ اختیار کیا۔

بس وہ دن تھا کہ اس کے بعد سے صبیغ اپنی قوم میں ذلیل ہو گیا، حالانکہ وہ اپنی قوم میں سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔)

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے اہل بصرہ کو لکھ دیا: ''اس کے ساتھ نشست و برخاست نہ کرنا۔''

ابوعثمان مہدی کا بیان ہے کہ **کان لو اتانا و نحن مأته تفرقنا عنه۔** (جب وہ آجا تا تھا تو سو آدمی بھی ایک جگہ بیٹھے ہوتے تو وہ سب فوراً متفرق ہو جاتے تھے۔)

سلیمان بن یسار کا بیان ہے کہ

ان صبیغ بن عسل قدم المدینة فجعل یسأل عن المتشابه فبعث الیه عمر و اعدّ له عراجین النخل فلما حضر قال له من انت قال عبداللہ صبیغ قال و انا عبداللہ عمر ثم قام فضرب راسه بعرجون فشجه ثم تابع ضربه حتیٰ سال الدم علی وجهه فقال حسب یا امیر المومنین قدو اللہ ذهب ماکنت جد فی راسی۔''

(صبیغ بن عسل ایک شخص تھا وہ مدینہ آیا اور بعض متشابہ آیتوں کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ حضرت عمر نے اس کو بلوا بھیجا اور پہلے سے بہت شاخیں درخت خرما کی اپنے پاس رکھوالیں۔ جب وہ آیا تو حضرت عمر نے پوچھا: ''تو کون ہے؟'' اس نے کہا کہ 'خدا کا بندہ صبیغ' عمر نے کہا: ''اور میں ہوں خدا کا بندہ عمر'' یہ کہہ کر اُٹھے اور ایک شاخ خرمے کی لے کر اس کے سر پر ماری جس سے اس کے زخم آ گیا۔ پھر برابر اس کو مارتے رہے یہاں تک کہ خون بہہ کر اس کے چہرے پر آیا۔ اس نے کہا ''بس بس یا امیر المومنین! کافی ہے۔ اب وہ خیال میرے دماغ سے نکل گیا جو گردش کر رہا تھا۔)

یہ الفاظ بہت معنی خیز ہیں، جبر و تشدد اور سختی و تعزیرا گر کسی علمی اعتراض اور وسوسۂ دماغی کے لئے تسکین کا ذریعہ بن سکتی ہے تو بیشک حضرت عمر کی یہ کاوش نتیجہ خیز ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

ابن سیرین کہتے ہیں:

کتب عمر الی ابی موسیٰ ان لا یجالس صبیغ و ان یحرم عطاءہ و رزقه۔

(حضرت عمر نے ابوموسیٰ اشعری کو جو بصرہ کے حاکم تھے لکھا کہ صبیغ کے پاس کوئی بیٹھے اٹھے نہیں اور بیت المال سے جو اس کا مقررہ ماہوار وظیفہ ہے وہ بند کر دیا جائے۔)

مسیب کی روایت ہے کہ:

انه خلف لابی موسیٰ الایمان المغلّظة مایجد فی نفسه مما کان شیئا فکتب فی ذلک الیٰ عمر فاجابه اظنه محل صدق فخلّیٰ بینه و بین الناس۔

(صبیغ مذکور نے ابوموسیٰ سے بڑی سخت قسمیں کھا کر بیان کیا کہ اب بالکل وہ سابقہ خیالات اس کے دل میں نہیں ہیں۔ ابوموسیٰ نے اسے حضرت عمر کو لکھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ سچ کہتا ہے اس کے بعد سے لوگوں کو اس سے ملنے جلنے کی ممانعت نہیں رہی۔)

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہبی سوال پر سختی و تشدد (Hard, harsh and violent attitude/कायेरता और हिंसा) کسی طرح مناسب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس سختی و تشدد کے بعد معترض کا یہ کہہ دینا کہ اس کی تسکین ہو گئی اس کے تسکین قلب کی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے طرز عمل سے عام افراد کو یہ خیال قائم کر لینے کا موقع مل سکتا ہے کہ سوال لاجواب تھا اور سوائے مظاہرۂ جبر و تشدد کے اس کا کوئی حل موجود نہ تھا۔

اس دور میں تصنیف و تالیف اور کتابت علوم و معارف کا کام بھی جو مفید ترین شعبہ ہے ایک مخصوص نظریہ کے ماتحت صرف نظر انداز نہیں بلکہ ممنوع قرار پا گیا تھا اور مسلمانوں کو علمی و مذہبی آثار کے قلمبند کرنے سے منع کیا جا رہا تھا۔

وہی مخصوص نظریہ جس کی بناء پر حضرت رسولؐ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتابت قرطاس کو بلاضرورت سمجھا تھا، اسی بنا پر اب عام ارباب قلم کو کتابت احادیث سے منع کیا جاتا تھا اور فرمایا جاتا تھا کہ لا کتاب مع کتاب اللہ ''خدا کی کتاب کی موجودگی میں اب کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے''

امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح کے شروع میں دبی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے:

اختلفوا فی کتابة الحدیث فکرھما طائفةمنھم عمر بن الخطاب۔

(احادیث کے قلمبند کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا ہے جن میں سے حضرت عمر ہیں۔)

عروہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے احکام حلال وحرام کے قلمبند کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر بعد میں آپ کی رائے میں تبدیلی ہوئی۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ

انی کنت ارید ان اکتب السنن وانی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیھم وترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا اشعب کتاب اللہ بشیٔ ابدا۔

(میرا ارادہ ہوا تھا کہ احادیث کے قلمبند کرانے کا انتظام کروں لیکن مجھے خیال آیا کہ بہت سے لوگ سابقہ امم واقوام میں انھوں نے کتابیں تصنیف کیں تو ان ہی کتابوں کے ہو رہے اور کتاب خدا کو ترک کر دیا۔ میں خدا کی قسم کتاب خدا کے ساتھ کسی چیز کی آمیزش نہیں ہونے دوں گا۔)

دوسرے لوگوں میں بھی بعض افراد نے اس خیال میں آپ کے ساتھ اتفاق کیا۔ ابن سیرین کہتے تھے:

انما ضلّت بنو اسرائیل بکتب ورثوھا عن أبائھم۔

(بنی اسرائیل جو گمراہ ہوئے، وہ ان ہی کتابوں سے جو باپ دادا سے انھیں پہنچی تھیں۔)

زہری کا قول ہے **کنا نکرہ کتاب العلم** (ہم لوگ علمی مطالب کے قید تحریر میں لانے والوں کو ہمیشہ بُری نظر سے دیکھتے رہے۔)

یہ تو علمی وتبلیغی شعبوں کی خانہ ویرانی تھی لیکن اس کے برخلاف فوج کشی وصف آرائی میں انہماک، آس پاس کے ممالک پر جارحانہ حملوں کا جوش، اسلامی مملکت کی توسیع کا خیال اور فتح وظفر کا خروش، جس کی بنا پر اس زمانہ کو نشر واشاعت اسلام کا سب سے زائد زرّیں دور کہا جاتا ہے وہ اعلیٰ پیمانہ پر جاری تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت کے ذمہ دار افراد نے نشر اسلام کے رمز کو علوم ومعارف کی وسعت، حقائق مذہب کی تفسیر، اخلاق جمیلہ کی تلقین اور سیرت نبیؐ کی عملی حیثیت سے تبلیغ میں مضمر نہ سمجھا تھا بلکہ تلوار اور صرف تلوار میں۔

لیکن وہ جماعت کہ جو اقلیت میں تھی اور شروع میں اتنی کم کہ شمار میں آنے کے قابل نہ تھی، اس نے نشر واشاعت حق کے اصلی رمز کو سمجھ لیا تھا اور اس جوہر کی حفاظت میں اس نے پوری کوشش صرف کی اور اس نقطہ نظر کی تبلیغ میں، جسے وہ سچائی کے ساتھ حقیقی اسلام کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتی تھی، پُرامن تبلیغ وتلقین کے سلسلہ کو اختیار کیا اور ملک کی پر امن فضا کو مکدر کئے بغیر وہ اشاعت حق کے فرض کو انجام دیتی رہی۔

یہ جماعت شیعی جماعت ہے جس کی ابتداء، نشوونما، ترقی و وسعت سب تبلیغ وتعلیم کے ذریعہ سے ہوئی اور اس نے اس فرض کو پوری جانفشانی وتندہی کے ساتھ انجام دیا۔

مذہب شیعہ کی سب سے پہلی تبلیغ

یہ امر تاریخی حیثیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد سب سے پہلی جماعت جس نے اکثریت اور دبدبۂ حکومت کے خلاف تبلیغ حق کی آواز بلند کی ہے، وہ صحابہ کرام میں سے بارہ آدمیوں کی جماعت تھی: خالد بن سعید بن العاص، ابی بن کعب، ابوذر غفاری، مقداد بن

اسود کندی، عبادہ بن صامت، سلمان فارسی، ابوالہیثم بن یتہاں، عمار بن یاسر، خزیمہ بن ثابت، ذوالشہادتین، سہل بن حنیف، ابوایوب انصاری، جابر بن عبداللہ۔

یہ لوگ تھے جنھوں نے ابتدائی دور میں مسجد نبوی کے اندر نماز جمعہ کے بعد ہی کھڑے ہوکر باری باری اعلان حق کے فرض کو انجام دیا اور انتہائی جرأت کر کے ایمانی قوت اور جوش وخروش کے ساتھ بسیط تقریروں میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔

علامہ فضل بن شاذان نے جو دوسری صدی ہجری کے محدث اور مورخ ہیں، ان تقریروں کو اپنی کتاب رجال میں مکمل طور سے درج کیا ہے اور صدوق ابن بابویہ قمی کی کتاب امالی اور طبرسی کی کتاب الاحتجاج میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

یہ مذہب شیعہ کی سب سے پہلی تبلیغ تھی جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اس اعلان کے ساتھ ادا کی گئی اور یہی حضرات وہ تھے جنھوں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انتہائی پرامن طریقہ سے مذہب تشیع کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔

سلسلۂ تبلیغ میں پہلا دورۂ سفر

حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے تبلیغ کے دائرہ کو وسیع کیا اور مذہب شیعہ کو حجاز کی چوحدی سے باہر دوسرے ملک میں شائع ومنتشر کیا۔ اس وقت جب عثمان نے ان کو شام بھجوا دیا اور ملک شام کے پائے تخت (Capital/राजधानी) ''دمشق'' میں ان کا رہنا حکومت شام کے ملکی مصالح کے خلاف ثابت ہوا تو ان کو شام کے بیرونی دیہات اور کوہستانی علاقہ کی طرف جس کا نام ''جبل عامل'' ہے روانہ کر دیا گیا۔ یہاں انھیں شیعیت کی تبلیغ کا کافی موقع مل گیا اور سب سے پہلے جس قریہ میں ان کا داخلہ ہوا وہ ''میس'' ہے اور اسی نے پورے طور سے ان کی دعوت پر لبیک کہی۔ دوسرا قریہ ''صرخند'' ہے جہاں کے رہنے والوں نے تشیع کو قبول کیا اور یہاں حضرت ابوذرؓ کے نام کی ایک مسجد اور زیارت گاہ بطور یادگار اب تک قائم ہے۔ (العرفان، ج۸ ص ۷۶۴)

اسی سلسلۂ تبلیغ میں ان کو وہ سخت تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں جن کا آخری دل سوز نتیجہ ''ربذہ'' کے بے آب وگیاہ چٹیل میدان غربت میں ایک حسرت ناک موت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تبلیغ شیعیت کے مختلف دور

بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنت میں تشیع کا نام بھی لینا جرم سمجھا جاتا تھا اور کیا مجال تھی کہ کوئی شخص عقیدۂ تشیع کا اظہار بھی کر سکے۔

مگر مبارک تھیں وہ ہستیاں جنھوں نے سلطنت وقت کے تمام جاہ وجلال، شوکت وجبروت کے باوجود اپنے فریضۂ تبلیغ حق میں کوتاہی نہیں کی۔ انھوں نے قید وبند کی سختیاں گوارا کیں۔ سولیوں پر جانا اور تلواروں سے گردنوں کا قلم ہونا منظور کر لیا مگر کھنچی ہوئی تلواروں کی چھاؤں میں بھی ان کی زبانیں اعلائے کلمۂ حق میں مصروف رہیں۔

اموی سلطنت کے دور میں حجر بن عدیؒ، میثم تمارؒ، رشید ہجریؒ اور آخر میں سعید بن جبیر تابعیؒ اور بنی عباس کے دور میں ابن سکیت نحویؒ وغیرہ وہ شہدائے راہ حق ہیں جنھوں نے حق گوئی کے جرم میں پاداش قتل کو برداشت کیا۔

بہت سے کارپردازان تبلیغ تھے جنھوں نے تقیہ تج دیا جیسے کمیتؒ بن زید اسدی جن کی زلزلہ افگن شاعری سرتاسر تبلیغ مذہب کا پہلو لئے ہوئے تھی اور اسی طرح فرزدقؔ، دعبلؔ، سید حمیری وغیرہ۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے زمانہ میں تقیہ کی پابندیاں بہت کم تھیں، اس لئے شیعی علم کلام نے خوب ترقی کی اور مبلغین کو ایک حد تک آزادی سے دعوت وتبلیغ کا موقع ملا۔

ان میں ہشام بن حکم، ہشام بن سالم، قیس ماصر، مومن الطاق وغیرہ بڑے متکلمین ہیں جنھوں نے مناظرات ومصنفات کے ذریعہ سے مذہب شیعہ کے بڑے خدمات انجام دیئے۔

اصحاب ائمہ کا دور ختم ہونے کے بعد علمائے مذہب کا دور شروع ہوتا ہے جس میں تبلیغ مذہب کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔

ان میں سے ہر دور کے سرآمد مبلغین اوران کے علمی وتبلیغی خدمات کا تذکرہ بہت زیادہ بسط وتفصیل کا محتاج ہے، جس کے لئے اگر زمانہ مہلت دے اور توفیق الٰہی شامل حال ہو تو ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ اس وقت نہ تو وقت ہے اور نہ موقع ومحل کا اقتضاء ان تمام مبلغین کے تذکرہ کی اجازت دیتا ہے۔

مملکت ایران میں صفوی سلاطین 'خدا ان کی روحوں کو اپنی رحمت کاملہ سے سیروسیراب فرمائے' انھوں نے ایران میں مذہب شیعہ کی نشرواشاعت میں پورے انہماک کے ساتھ (مگر بزور شمشیر نہیں) کوشش کی اور اس میں اتنے کامیاب ہوئے کہ ایران پورا ایک شیعی ملک کی شکل میں آ گیا۔

ہندوستان میں مذہب شیعہ کی تبلیغ

ہندوستان میں شیعی مذہب کی تبلیغ کا سہرا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایرانیوں کے سر ہے اوران میں بہت زیادہ سادات کو خصوصیت ہے۔

ہندوستان ہمیشہ سے زرخیز اور مال ودولت کا خزانہ مشہور رہا ہے، اس لئے غیر ممالک کے لوگ جب پریشانی میں مبتلا ہوتے تو سب سے پہلے اپنے درد کا درماں یہی سمجھتے تھے کہ ہندوستان چلے آئیں۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں شریف مسلمانوں کے خاندان بہت کم ایسے ہوں گے جن کا رشتہ ایران وعراق سے جڑا ہوا نہ ہو۔

سلاطین مغلیہ کے دور حکومت میں بڑے بڑے ارکان دولت اور ذمہ دار اجزائے مملکت زیادہ تر ایرانی نژاد اور شیعہ تھے اوران ہی کے ذریعے سے علمائے شیعہ کا جز زیادہ تر ایرانی یا عراقی ہوا کرتے تھے سلسلۂ آمد ورفت قائم تھا اور اکثر حضرات کو ان میں سے یہاں قیام کا موقع حاصل ہوتا تھا۔

صوفیت کے لباس نے 'میرے خیال میں' تشیع کی پرورش میں بڑا کام کیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر صوفیائے کرام کے خیالات بعض امور میں شیعوں سے ملتے جلتے اوران کے قریب ہوتے ہیں اور کم از کم ان کو تعصب شیعوں سے اتنا نہیں ہوتا جتنا دوسرے بہت سے افراد کو۔ حیدرآباد میں شیعیت کی تبلیغ اسی تصوف کے پردے میں شاہ طاہر رحمۃ اللہ علیہ نے کی جو ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت ہے اور تاریخ کے رو سے ناقابل انکار امر، کہ اس تمام طول طویل مدت میں شیعی افراد کتنے ہی برسر اقتدار ہوئے اور حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور جاہ ومنصب حاصل کئے مگر ان کی ترقیاں شخصی وانفرادی تھیں اجتماعی ومذہبی حیثیت سے کوئی تبلیغ واشاعت مذہب کی اس دور میں نظر نہیں آتی۔

اس اعتبار سے اولیت کا شرف صرف ایک مجاہد ملی کو حاصل ہے جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے پیدا ہوا اور جس نے اپنے ثبات واستقلال، ولولۂ عمل، اخلاص قلب اور جوش مذہبی سے زمین کو آسمان بنا دیا اور ہندوستان بالخصوص صوبۂ اودھ کی مذہبی فضا میں وہ تشیع کی روح پھونکی جس کے روز افزوں نتائج آج شیعوں کی ڈھائی کروڑ کے قریب مردم شماری کی صورت میں نظر آ رہے ہیں۔

یہ بزرگ ہستی مجدد ملت حقہ حضرت غفران مآب مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ کی تھی جنھوں نے عراق وایران سے تکمیل علوم کر کے ہندوستان مراجعت کی اور لکھنؤ کو اپنا مرکز بنا کر شیعیت کا عملی حیثیت سے سنگ بنیاد قائم کیا۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سب سے پہلی نماز جماعت جو اس ملک میں شیعوں کی منعقد ہوئی ہے وہ ۱۷؍رجب ۱۲۰۰ھ [۱] کو مسجد حسن رضا خان واقع گول [۲] دروازہ لکھنؤ میں تھی جس میں

(۱) ہندوستان میں شیعوں کی پہلی نماز جمعہ ۲۷؍رجب ۱۲۰۰ھ کو غفران مآبؒ کی اقتدا میں ہوئی۔

(۲) افسوس ہے کہ اس مسجد کا نام ونشان بھی اب نہیں ہے۔ کوتوالی اور دوسری عمارتوں کی بنیاد اس مسجد کی خراب شدہ بنیادوں پر قائم اور تاریخ وحسیات مذہبی کے لئے ماتم کا سرمایہ ہے۔

جناب غفران مآب مقتدا اور نواب مع ارکان دولت اور عام مومنین شہر مقتدی تھے۔ اس کے قبل کوئی نماز جماعت شیعوں کی اس ملک میں نہ ہوئی تھی۔

انھوں نے ''عماد الاسلام'' لکھ کر ملت حقہ کی ناقابل تزلزل بنیاد قائم کی اور ''ذوالفقار''، ''صوارم''، ''حسام'' سے جہاد مذہب میں بیش قیمت کارنامے پیش کئے۔

ان کی اولاد اور تلامذہ نے ان کے قائم کئے ہوئے شجر کو سر بلند و شاداب رکھنے میں پوری کوشش صرف کی اور ملت حقہ کے گراں بہا خدمات انجام دیئے جن کے بہترین نمونے جناب سلطان العلماء رضوان مآب طاب ثراہ کی ''ضربت حیدریہ'' و''طعن الرماح'' وغیرہ۔ سید العلماء علیین مکانؒ کی ''حدیقۂ سلطانیہ''، مولانا مفتی محمد قلی صاحب اعلی اللہ مقامہ کی ''تشئید المطاعن''، جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ کی ''روائح القرآن'' و ''جواہر عبقریہ''، مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی ''استقصاء الافہام'' اور ''عبقات الانوار'' کی صورت میں موجود ہیں اور جن کے تبلیغی نقوش ملت بیضا کے صفحات پر روشن حروف میں ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔

زمانہ رنگ بدلتا ہے اور ضروریات زمانہ میں بھی اس کے ساتھ انقلاب ہوتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان شرفاء اپنے ایرانی نژاد ہونے کا احساس رکھتے تھے اور اس لئے اپنی اصلی زبان فارسی رکھنے کو فخر سمجھتے تھے۔ اس زمانہ کے عوام تک فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے اور فارسی کتابوں کا شوق سے مطالعہ کرتے تھے، اس لئے اس زمانہ کے ارباب قلم اپنے مصنفات بھی فارسی میں زیادہ تر تحریر کرتے تھے۔ لیکن زمانہ نے ورق پلٹا۔ اُردو نے فارسی کی جگہ حاصل کی اور رفتہ رفتہ فارسی ترک ہونا شروع ہوئی یہاں تک کہ اب فارسی مثل عربی کے ایک علمی زبان ہوگئی جس کے جاننے والے خال خال نظر آتے ہیں اور زیادہ تر عام افراد فارسی کتابوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس لئے ضرورت ہوئی کہ تبلیغی مصنفات اہل ملک کے سامنے خود ان ہی کی مادری زبان اردو میں پیش کئے جائیں۔

گذشتہ دور کے علماء میں جناب تاج العلماء سید علی محمد صاحب قبلہ نے اس ضرورت کا خاص طور سے احساس فرمایا تھا انھوں نے مبسوط و مختصر گرانقدر عربی تصانیف کے علاوہ جن کی فہرست طویل ہے، مذہبی حقائق کو اردو کے لباس میں پیش کرنے کی طرف بھی توجہ فرمائی ان کا ''ترجمہ قرآن'' اپنے رنگ کا نرالا اور واحد ترجمہ ہے جو بہت حد تک اس مقصد کا ترجمان ہے اور ان کی بعض دوسری کتابیں بھی اس قسم کا ایک مخصوص سرمایہ ہیں۔

مرحوم و مغفور علامہ حکیم غلام حسنین صاحب کنتوری اعلی اللہ مقامہ کا بھی ذکر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تبلیغ مذہب میں صرف کیا اور مضامین و مولفات کے ذریعہ سے شکوک و توہمات کا بڑے درجہ تک استیصال کیا۔

فخر الحکماء مولانا سید علی اظہر صاحب نے ''رسالۂ اصلاح'' کا اجراء کیا اور اس طرح نیز مستقل تصانیف کے ذریعہ سے تبلیغ مذہب کے ہزاروں برس گذرنے پر بھی نہ بھولنے والے خدمات انجام دیئے اور مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری مرحوم نے اپنی عمر کا آخری حصہ تمام تر تصنیف و تالیف میں صرف کر کے سنجیدہ طبقہ کے لئے انتہائی مفید ذخیرۂ معلومات پیش کیا۔

اس کے بعد مدرسۃ الواعظین اور امامیہ مشن دونوں ادارے آپ کے سامنے ہیں جو تقریری و تحریری تبلیغ کے مقصد سے قائم ہوئے اور شروع شروع قوم نے ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور ان کی ضرورت کا احساس و اعتراف کیا مگر اب تک یہ اس ترقی کے درجے تک نہیں پہنچے ہیں جو اس اہم مقصد کے شایان شان ہے۔

والسلام

(اشاعت اولیٰ ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ / دسمبر۔ جنوری ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۰ء)

۞۞۞